© rasailojaraid.com

تعلیم و تعلّم

برٹرینڈ رَسل
مترجم: جی آر عزیز

تعلیم میں حبِ وطن کا مقام

برٹرینڈ رَسل برطانیہ کا عظیم مفکر اور فلسفی گزرا ہے، اس کے زیر نظر مضمون میں مشہور فلسفہ ’حبِ وطن‘ کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے جو جہاں حقیقت شناسی کی عمدہ مثال ہے، وہاں مغربی اقوام کے مذموم ریاستی مقاصد پر بھی اچھے انداز میں روشنی ڈالتا ہے۔ جدید ریاست ابھی تک حبِ وطن کی یہی تعلیم دینے پر مصر ہے، جس سے انسانیت میں سرزمین وطن سے محبت کے نام پر نفرت کے بیج بوئے جا رہے ہیں۔ ح م

ہر آدمی بہت سے مقاصد اور خواہشات رکھتا ہے جن میں سے بعض تو خالص ذاتی ہوتی ہیں اور بعض ایسی جن کے بارے میں وہ دوسرے بہت سے لوگوں سے اشتراک کرسکتا ہے؛ مثلاً بہت سے لوگ روپیہ چاہتے ہیں اور دولت کمانے کے اکثر طریقے کسی نہ کسی گروہ کا تعاون چاہتے ہیں اور متعلقہ گروہ کا انحصار امیر ہونے کے مخصوص طریقے پر ہوگا۔ ایک ہی صنعت کے دو مختلف کارخانے اکثر معاملات میں ایک دوسرے کے رقیب ہوتے ہیں لیکن سیکورٹی ٹیکسوں کے بارے میں وہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔

بلا شبہ روپیہ ہی ایک ایسی چیز نہیں جس کی خاطر لوگ سیاسی قسم کے گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں؛ مثلاً وہ مختلف مذہبی فرقوں، برادریوں، علمی سوسائٹیوں اور فری میسن گروہوں اور نہ معلوم کن کن جماعتوں میں بٹ جاتے ہیں۔ انسانوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرنے والے محرکات متعدد ہیں، مثلاً مقاصد کی ہم آہنگی ان میں سے ایک ہے، خیالات کی یکسانی دوسرا اور خونی رشتے تیسرا۔ راسچائلڈ (Rothachild) خاندان کے لوگوں نے خونی رشتے کی وجہ سے ایک دوسرے سے تعاون کیا۔ اُنہیں اس ہیئتِ اجتماعی کے لیے رسمی قوانین کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ ایک دوسرے پر اعتبار کرسکتے تھے۔ ان کی کامیابی کی ایک وجہ یہ تھی کہ یورپ کے ہر اہم تجارتی مرکز میں ایک راسچائلڈ موجود تھا۔ باہمی تعاون کی ایسی مثال جس کا مدار خیالات کی ہم آہنگی پر ہو، زمانۂ مابعد جنگ میں کوئیکر (Quaker) جماعت کے انسانیت نواز کارنامے

© rasailojaraid.com

ہیں۔ چونکہ ان کا نظریۂ حیات ایک تھا، اس لیے وہ آسانی سے تعاون کرسکے۔ مشترک سرمائے کی کمپنیاں اور مزدوروں کی انجمنیں ایسے ادارے ہیں جن کی بنیاد ذاتی مفاد کی ہم آہنگی پر ہے۔

انسانوں کی جس جماعت کو کسی خاص مقصد کے لیے منظّم کیا جائے، اس کا مقصد اجتماعی اعتبار سے وہی ہوتا ہے جس کے لیے اس کی تنظیم کی جاتی ہے۔ اس لیے اس کی ذہنیت ایک فرد کے مقابلے میں زیادہ سادہ اور زیادہ ناتمام ہوتی ہے؛ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ نفسیاتی تحقیقات کی انجمن صرف نفسیاتی تحقیق ہی سے سروکار رکھتی ہے، گو اس کے رکن کے پیش نظر اور بھی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔ برطانوی صنعتوں کی وفاقی انجمن صرف برطانوی صنعت وحرفت کا خیال رکھتی ہے، اگرچہ اس کے اَراکین تماشوں اور کرکٹ کے میچ سے بھی لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر ایک خاندان صرف خاندانی جائیداد کا خیال رکھتا ہے اور اکثر اپنے کسی ایک فرد کو اس مقصد پر قربان کردینے کے لیے تیار رہتا ہے۔

ایسے ولولے جو سیاسی طور پر منظّم کرلیے جائیں، غیر منظّم جذبات کے مقابلے میں بہت زیادہ طاقتور ہوتے ہیں؛ جو لوگ اتوار کو سینما دیکھنا چاہتے ہیں، وہ بالکل ایک غیر منظّم بھیڑ ہوتی ہے اور سیاسی لحاظ سے بالکل بے وقعت۔ وہ اہل 'سبت' (Sabattarians) جو یہ خواہش رکھتے ہیں کہ لوگ نہ جائیں، منظّم ہوتے ہیں اور سیاسی اثر ونفوذ رکھتے ہیں۔ سینما کے مالک بھی منظّم ہوتے ہیں، اس لیے سیاسی نقطہ نگاہ سے اتوار کے دن سینما کھلا رکھنے کا سوال سینما کے مالکوں اور سبتیوں کے درمیان مابہ النزاع ہے جس میں عوام کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں۔

ایک خاص آدمی مختلف جماعتوں کا رُکن ہوسکتا ہے جن میں سے بعض مفید، بعض مضر اور بعض بے ضرر قسم کی ہوں گی۔ فرض کیجیے، ایک آدمی برطانوی فاشی جماعت، گاؤں کی فٹ بال ٹیم اور تحقیق انسانیت کی مجلس کا رکن ہے؛ وہ تیسری حیثیت سے قابل تعریف، دوسری حیثیت سے معصوم اور پہلی حیثیت سے قابل نفرت ہے۔ وہ خود نیکی اور برائی کا مجموعہ ہے۔ لیکن ان اداروں کا اخلاقی کردار اچھا یا برا، جو کچھ بھی ہے، غیر مخلوط ہے جو ان اراکین میں نہیں پایا جاتا۔

اس امر کا انحصار کہ آیا کون انجمن اچھی ہے یا بری؟ انجمن میں شامل ہونے والے لوگوں

© rasailojaraid.com

کے کردار پر نہیں ہوتا بلکہ اُس مقصد پر ہوا کرتا ہے جس کی خاطر لوگوں کی تنظیم کی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا دور دراز خیالات کے اظہار کا مقصد ان عجیب نتائج تک پہنچنا ہے جو انسانوں کی اُس تنظیم سے صادر ہوتے ہیں جسے 'ریاست' کہتے ہیں۔ تقریباً تمام مہذب ممالک میں ریاست ان تمام تنظیموں سے زیادہ طاقتور ہے جن کے ساتھ انسان کا تعلق ہوتا ہے، اس لیے حکومت کا رکن ہونے کی حیثیت سے اس کے مقاصد سیاسی لحاظ سے دوسرے تمام مقاصد کے مقابلے میں بہت زیادہ مؤثر ہوتے ہیں، اس لیے اس مسئلے پر غور کرنا اہم ہو جاتا ہے کہ زمانۂ حاضر کی ریاست کے مقاصد کیا ہیں؟

ریاست کے فرائض کچھ تو داخلی ہوتے ہیں اور کچھ خارجی، اس لیے میں مقامی حکومت کو بھی ریاست کے فرائض میں شامل کرتا ہوں؛ مجملاً یوں کہا جاسکتا ہے کہ ریاست کے داخلی فرائض تو اچھے ہیں لیکن خارجی برے۔ یہ بیان بلا شبہ اتنا سادہ ہے کہ حرف بہ حرف درست نہیں ہوسکتا لیکن یہ اوّلین مفید تخمینے کا قائم مقام ہے۔ حکومت کے داخلی فرائض میں سڑکیں، روشنی، تعلیم، پولیس، قانون اور ڈاک خانہ وغیرہ شامل ہیں۔ ملکی انتظام کی تفصیلات کے بارے میں تو کسی کو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن صرف ایک نراجی ہی یہ کہے گا کہ یہ مقاصد بہ ذاتِ خود غیر پسندیدہ ہیں۔ جہاں تک ریاست کی داخلی سرگرمیوں کا تعلق ہے، وہ مجموعی طور پر باشندگانِ ملک کی وفاداری اور اِمداد کی مستحق ہے!

جب ہم اس کے خارجی مقاصد کی طرف آتے ہیں تو معاملہ مختلف ہو جاتا ہے۔ باقی دنیا کے معاملے میں ایک بڑی ریاست کے مقاصد دو ہوتے ہیں۔ جارحانہ حملوں کا دفاع اور غیر ملکی وسائل کے استعمال میں باشندگانِ ملک کی امداد۔ جارحانہ حملوں کا دفاع، جب خطرہ واقعی ہو اور حملے کو روکنے کے لیے ضروری نظر آئے تو ظاہر ہے کہ اسے مفید قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو ذرائع حملوں کی روک تھام کے لیے درکار ہیں، وہی دوسرے ممالک کے استحصال میں کارآمد ہوتے ہیں۔

دنیا کی طاقتور ریاستوں کا مقصد کمزور ملکوں کی محنت اور ان کی معدنی دولت سے اقتصادی خراج وصول کرنا ہے اور اس خراج کی وصولی کے لیے مسلح افواج کو جن کا برائے نام مقصد

© rasailojaraid.com

دفاع ہوتا ہے، استعمال کیا جاتا ہے؛ مثلاً جب یہ معلوم ہوا کہ ٹرانسوال میں سونا موجود ہے تو حکومتِ برطانیہ نے اس پر حملہ کردیا، اور لارڈ سالسبری نے قوم کو یقین دلایا کہ ہمارا مقصد سونے کی کانیں حاصل کرنا نہ تھا، لیکن ہم کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ ہی گئے جہاں سونے کی کانیں موجود تھیں اور جب لڑائی ختم ہوئی تو ہم نے اپنے آپ کو ان کا مالک پایا۔

ایک اور مثال لیجیے: ہر شخص جانتا ہے کہ انگریز جنوبی ایران میں وہاں کی باشندوں کی بھلائی کے لیے گئے تھے، لیکن یہ امر مشکوک ہے کہ اگر ایرانی اس علاقے کے باشندے نہ ہوتے جہاں تیل کا بے اندازہ ذخیرہ موجود ہے تو آیا ہم ان کی بہتری میں اتنی دلچسپی لیتے؟ وسطی امریکہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بعض کارناموں کے متعلق بھی اس طرح کی باتیں کہی جاسکتی ہیں۔اسی طرح منچوریا میں جاپان کے جانے کا محرک بھی شریف ترین جذبہ تھا لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ جاپانیوں کے مقاصد سے ہم آہنگ واقع ہوا ہے۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ اکثر طاقتور ریاستوں کی حالیہ غیر ملکی سرگرمیوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلح افواج کی امداد یا ان کی دہشت سے کام لے کر کمزور حکومتوں سے وہ دولت ہتھیالی جائے جو قانونی طور پر ان کی اپنی ملکیت ہے۔اس قسم کی سرگرمیاں اگر افراد سے نجی طور پر سرزد ہوں تو جرم میں شمار ہوتی ہیں اور اگر بہت وسیع پیمانے پر نہ ہوں تو ان کے لیے سزا بھی دی جاتی ہے، لیکن اگر یہ قوموں سے صادر ہوں تو اہل ملک اُنہیں قابل ستائش سمجھتے ہیں۔

اس فکر و نظر سے میں اپنے اصل موضوع یعنی مدرسوں میں حبِ وطن کی تعلیم پر پہنچ گیا ہوں۔
اس تعلیم پر تنقید سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم نہ صرف اس کے منشا بلکہ اس کے حقیقی اثرات کے متعلق بھی وضاحت سے کام لیں۔حبِ وطن کا منشا اس کے حامیوں کے خیال کے مطابق ایک ایسی چیز ہے جو بڑی حد تک اچھی ہے۔گھر کی محبت اور اپنے وطن کی محبت بلکہ ایک خاص حد تک اس کے کارناموں پر فخر کرنا جہاں تک وہ فخر کے مستحق ہیں، یہ چیزیں مذموم نہیں۔ یہ ایک مختلف الاجزا جذبہ ہے جو کچھ تو وطن کی محبت اور اس کے مانوس قرب و جوار سے متعلق ہے اور کچھ اس جذبے سے وسیع تر خاندانی محبت سے مماثل ہے۔

اس جذبے کی اساس کچھ تو جغرافیائی اور کچھ حیاتیاتی ہے لیکن یہ ابتدائی جذبہ بذاتِ خود نہ

© rasailojaraid.com

تو سیاسی ہے اور نہ اقتصادی۔ یہ ایک آدمی کا احساس ہے اپنے وطن کے حق میں نہ کہ دوسرے ملکوں کے خلاف۔ یہ جذبہ اپنی ابتدائی صورت میں اُن دیہاتیوں کے سوا، جنھیں سیر و سیاحت کا بہت کم اتفاق ہوا، دوسرے لوگوں میں بمشکل پایا جاتا ہے۔ جو شہری ہمیشہ اپنی سکونت کو بدلتا رہے اور جس کے پاس زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا نہ ہو جسے وہ اپنا کہہ سکے، اس میں یہ ابتدائی جذبہ جس سے حبِ وطن کا احساس پیدا ہوا ہے، دیہاتی مالکان زمین یا کسانوں کے مقابلے میں بہت کم ہوگا۔ اس کے بجائے شہری میں ایک اور احساس ہوگا جو زیادہ تر مصنوعی اور اس کی تعلیم اور اخبارات کی پیداوار ہوگا اور تقریباً مکمل طور پر ضرررساں ہوگا۔ اس جذبے کی اساس وطن اور اہل وطن کی محبت پر اس قدر نہیں ہوتی جتنی دوسرے ممالک کی نفرت اور ان پر قبضہ کرنے کی خواہش پر ہوا کرتی ہے۔ تمام بُرے جذبات کی طرح یہ جذبہ بھی وفاداری کے بھیس میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ کوئی انسان ایک ایسے قابل نفرت جرم کا مرتکب ہو جس کے نام سے بھی وہ ڈر کر پیچھے ہٹ جائے تو پہلے اس کے دل میں مہا بدمعاشوں سے وفاداری کا جذبہ پیدا کیجیے، پھر اس جرم کو وصفِ وفاداری کے بھیس میں اس کے سامنے لائیے، حبِ وطن اس طریق عمل کی بہترین مثال ہے؛ مثلاً قومی جھنڈے کے احترام کا سوال ہی لیجیے، جھنڈا جنگجو قوم کا نشان ہوتا ہے۔ یہ دل میں لڑائی، جنگ، فتح اور بہادری کے کارناموں کے خیالات پیدا کرتا ہے۔ برطانوی جھنڈا ایک انگریز کو نیلسن اور ٹریفالگر (Trafalgar) کی یاد دلائے گا، نہ کہ شیکسپیئر، نیوٹن اور ڈارون کی۔

جو کام انسانی تہذیب کی ترقی کے سلسلے میں انگریزوں نے کیے ہیں وہ قومی جھنڈے تلے نہیں کیے گئے اور جب اس جھنڈے کی تعظیم کی جاتی ہے تو یہ چیزیں ذہن میں نہیں آتیں۔ انگریزوں نے اپنے بہترین کارنامے انگریزوں کی حیثیت میں نہیں بلکہ افراد کی حیثیت میں انجام دیے ہیں۔ جو کارنامے انگریزوں نے انگریز ہونے کی حیثیت میں یا اس احساس کے ماتحت کہ وہ انگریز ہیں، انجام دیے ہیں، کم قابل تعریف قسم کے ہیں، اور یہی وہ کارنامے ہیں جن کی تعریف قومی جھنڈا ہم سے کرانا چاہتا ہے۔ جو بات انگریزی قومی جھنڈے کے

© rasailojaraid.com

بارے میں درست ہے، وہی ستاروں اور دھاریوں والے یا کسی دوسری طاقتور قوم کے جھنڈے کے بارے میں بھی صحیح ہے۔

تمام مغربی ممالک میں لڑکے لڑکیوں کو سکھایا جاتا ہے کہ ان کی نہایت اہم سماجی وفاداری اس ریاست کے ساتھ ہے جس کے وہ شہری ہیں اور ان کے ذمے ریاست کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ جس طرح اُنہیں حکومت کہے، وہ ویسا ہی کریں۔اس خیال سے کہ مبادا وہ اس نظریے پر اعتراض کر بیٹھیں، اُنہیں غلط تاریخ، غلط سیاسیات اور غلط اقتصادیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔اُنہیں غیر ممالک کی بداعمالیوں کی روداد سنائی جاتی ہے، لیکن اپنی حکومت کی بداعمالیوں کی نہیں۔ اُنہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ تمام وہ جنگیں جن میں ان کے ممالک نے حصہ لیا ہے، دفاعی جنگیں ہیں لیکن دوسرے ممالک کی جنگیں جارحانہ ہیں۔اُنہیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ جب ان کا ملک خلافِ توقع کسی دوسرے ملک کو فتح کر لیتا ہے تو اس کا مقصد تمدن، انجیل کی روشنی، اخلاقِ حسنہ، امتناعِ مسکرات یا اسی طرح کے اور ایسے ہی بلند مقاصد کی اشاعت ہوتی ہے؛ نیز اُنہیں بتایا جاتا ہے کہ دوسرے ممالک کا کوئی معیارِ اخلاق نہیں اور جیسا کہ انگریزوں کا قومی ترانہ کہتا ہے: ''قدرت کا یہ فرض ہے کہ دشمنوں کے بدمعاشانہ مکروفریب کو تہس نہس کردے۔'' قدرت کا یہ فرض ایسا ہے جس کی بجا آوری کے لیے وہ ہمیں آلۂ کار بنانے میں تامل نہیں کرے گی۔حق یہ ہے کہ جب کسی قوم کو دوسری قوم سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ اس قدر جرائم کا ارتکاب کرتی ہے جتنے اس کی مسلح افواج سے بن پڑتے ہیں۔ عام شہری بلکہ مہذب شہری بھی اُن سرگرمیوں کو سراہتے ہیں جن کی وجہ سے یہ جرائم واقع ہوتے ہیں کیونکہ نہ تو اُنہیں یہ علم ہوتا ہے کہ کیا کچھ ہو رہا ہے اور نہ وہ واقعات کو صحیح پس منظر میں دیکھتے ہیں۔

ایک عام شہری نادانستہ طور پر استحصال کی خاطر قتل وخون میں شریک ہونے پر رضا مندی ہوجاتا ہے۔ اس رضامندی کی ذمہ داری زیادہ تر تعلیم پر ہے۔بعض لوگ اخبارات کو بُرا بھلا کہتے ہیں لیکن میرے رائے میں وہ اس معاملے میں غلطی پر ہیں۔ اخبارات ویسے ہی ہوں گے جیسے عوام چاہیں گے اور عوام بُرے اخبارات پسند کرتے ہیں کیونکہ ان کی تعلیم برے طریقے پر ہوتی ہے۔قوم پرستانہ جذبہ حبِ وطن مدرسے میں سکھائے جانے کے بجائے ایسا اجتماعی مرض

© rasailojaraid.com

ہے جس کی زد میں بد قسمتی سے لوگ آ جاتے ہیں اور جس سے بچاؤ کے لیے اُنہیں ذہنی اور اخلاقی طور پر مستحکم بنایا جانا چاہیے۔

بلا شبہ جذبۂ قومیت ہمارے عہد کی سب سے زیادہ خطرناک بُرائی ہے جو شراب نوشی، مسکرات، کاروباری بد دیانتی اور اس طرح کی دیگر برائیوں سے بھی خطرناک ہے جن سے بچاؤ رسمی اخلاقی تعلیم کا منشا ہے۔ تمام وہ لوگ جو دنیاے جدید کا جائزہ لینے کی اہلیت رکھتے ہیں، جانتے ہیں کہ جذبۂ قومیت کی وجہ سے ہماری تہذیب کی بقا خطرے میں پڑ گئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس حقیقت سے تقریباً تمام وہ لوگ آشنا ہیں جو بین الاقوامی معاملات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود قومی دولت کو ہر جگہ اس تباہ کن بُرائی کی اشاعت اور تقویت پر صرف کیا جارہا ہے۔ جو لوگ اس خیال کے ہیں کہ بچوں کو یہ نہ سکھایا جائے کہ وہ لوگوں کے قتل عام کو انسان کا بہترین عمل خیال کریں، اُنہیں غدار اور اپنے ملک کے سوا باقی تمام ملکوں کا دوست بنا کر بُرا بھلا کہا جاتا ہے۔ یہ خیال ہوسکتا تھا کہ چونکہ والدین کو بچوں سے قدرتی لگاؤ ہوتا ہے، اس لیے اُنہیں یہ خیال دکھ دے گا کہ ان کے بچے عذاب میں مبتلا ہوکر مریں، لیکن صورتِ حال یہ نہیں ہے۔ اگرچہ خطرہ یقینی ہے لیکن اکثر ممالک میں اقتدار کے مالک ان تمام کوششوں کو جو اس خطرے کی روک تھام کے لیے کی جارہی ہیں، ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ فوجی ملازمت کو اپنے ملک کی حفاظت کے لیے 'شریف ترین اہتمام' کہا جاتا ہے اور نوجوانوں کو اس امر سے آگاہ کرنے کے لیے ایک لفظ نہیں کہا جاتا کہ اگر ان کا ملک طاقتور ہے تو فوجی اقدامات دفاعِ ملک کے بجائے زیادہ تر دوسرے ممالک کے خلاف جارحانہ اقدامات پر ہی مشتمل ہوں گے۔

حبِ وطن کی تعلیم کے خلاف کئی اعتراض ہیں: پہلا اعتراض تو وہی ہے جس پر ہم ابھی بحث کر چکے ہیں، یعنی جب تک جذبۂ قومیت کا زہر کم نہ ہوگا، اُس وقت تک تمدن کی بقا کی کوئی صورت نہیں۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جس ادارے میں لوگوں کو انسانوں کے قتل کی تعلیم دی جارہی ہو، وہاں اُنہیں مہذب انسانی نصب العین کی تعلیم دینا بے حد دشوار ہے۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ نفرت کی تعلیم جو جذبۂ قومیت کا ایک ضروری حصہ ہے، بذاتِ خود ایک بُری چیز ہے۔

© rasailojaraid.com

لیکن ان اعتراضات کے علاوہ اس تعلیم کے خلاف ایک خالص عقلی اعتراض بھی ہے، یعنی قومیت کی تعلیم کئی بے سروپا باتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں بچوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ ان کا ملک بہترین ملک ہے، اور سوائے ایک ملک کے باقی ممالک میں یہ بات غلط ہے۔ چونکہ مختلف اقوام اس امر پر متفق نہیں ہوسکتیں کہ وہ کون سا ملک ہے جس کے متعلق یہ بات درست ہے، اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ دوسری اقوام کی تذلیل کرکے اپنی قوم کی خوبیوں پر زور دینے کی عادت کو چھوڑ دیا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خیال سرے سے مفسدانہ اور بعض صورتوں میں خلافِ قانون سمجھا جاتا ہے کہ بچوں کو جو کچھ پڑھایا جائے، وہ امکانی حد تک درست ہونا چاہیئے، لیکن پھر بھی میرا عقیدہ یہی ہے کہ جھوٹ سکھانے سے سچ سکھانا بہتر ہے۔

تاریخ تمام ممالک میں ایک ہی طرح پڑھائی جانی چاہیے اور نصاب کی تاریخی کتابیں 'مجلس اقوام' کی نگرانی میں لکھوائی جانی چاہئیں جس کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور روس سے ایک ایک معاون کی خدمات حاصل کی جائیں۔ تاریخ کو عالمی تاریخ ہونا چاہیے، نہ کہ قومی تاریخ اور اسے جنگوں کے بجائے ثقافتی اہمیت کے معاملات پر زور دینا چاہیے۔ جس حد تک لڑائیوں کا پڑھانا ضروری ہو، وہ صرف فاتحانہ اور دلیرانہ کارناموں کے زاویۂ نگاہ سے نہ پڑھائی جائیں۔ طالب ِعلم میدانِ جنگ میں زخمی سپاہیوں کے درمیان ٹھہریں اور اُنہیں غیر آباد علاقوں میں بے گھر لوگوں کی حالتِ زار کا احساس دلایا جائے اور نیز اُنہیں ان تمام مظالم اور بے انصافیوں سے آگاہ کیا جانا چاہیے جن کے مناظر لڑائی میں نظر آتے ہیں۔

موجودہ حالت میں تقریباً تمام تعلیم جنگ کی عظمت نمایاں کرنے والی ہے۔ مدارس کی تعلیم کے مقابلے میں صلح کل کی داعی جماعت کی تمام مساعی بے اثر ہیں۔ یہ حالت بالخصوص ان مدارس کی ہے جو اُمرا کے بچوں کے لیے مخصوص ہیں اور جو ہر جگہ ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے غربا کے مدارس کے مقابلے میں پست تر ہیں۔ بچوں کو مدارس میں دوسری اقوام کے نقائص تو بتا دیے جاتے ہیں لیکن اپنی قوم کے نقائص نہیں بتائے جاتے۔ دوسری اقوام کے نقائص جاننے سے انسان میں اپنے آپ کو حق پر سمجھنے اور جنگجو بننے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، حالانکہ اپنے عیوب سے باخبر رہنا مفید ہوتا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

کون سے انگریز بچوں کو مدارس میں آئرلینڈ کے بلیک اینڈ ٹینز (Black and Tans) کے واقعات کے متعلق سچ بتایا جاتا ہے؟ کون سے فرانسیسی بچوں کو سیاہ افواج کے قبضۂ روہر کے بارے میں سچائی بتائی جاتی ہے؟ کون سے امریکی لڑکے کو ساکو (Sacco) اور ونزٹی (Vanzetti) کے متعلق یا مونی (Mooney) اور بلنگز (Billings) کے بارے میں صحیح واقعات بتائے جاتے ہیں؟ انہی نظر اندازیوں کی وجہ سے ہر مہذب ملک کا ایک عام شہری خود فریبی میں پھنسا رہتا ہے، وہ باقی اقوام کے متعلق ان تمام اُمور سے باخبر ہوتا ہے جو خود اُنہیں معلوم نہیں ہوتے اور اسے ان باتوں کی خبر نہیں ہوتی جو دوسری قومیں اپنے ملک کے متعلق جانتی ہیں۔

حبِ وطن کی تعلیم کا اکثر حصہ تو عقلی طور پر غلط ہے، تاہم اخلاقی لحاظ سے اس کی حیثیت بے ضرر ہے۔ جو لوگ پڑھاتے ہیں خود اُنہیں غلط طریقے پر تعلیم دی گئی تھی؟ چنانچہ وہ یہ محسوس کرنا سیکھ گئے ہیں کہ جس دنیا میں دوسرے ممالک کے لوگ ایسے برے ہیں، وہاں عظیم فوجی مساعی ہی ان کے ملک کو تباہی سے بچا سکتی ہیں۔ بہرحال حبِ وطن کے اس پروپیگنڈے کا ایک اور کم بے ضرر پہلو بھی ہے۔ کچھ مفاد ایسے ہیں جو اس پروپیگنڈے سے زراندوزی کا کام لیتے ہیں۔ صرف اسلحہ سازی کے مفاد ہی نہیں بلکہ وہ مفاد بھی جنہوں نے پس ماندہ ملکوں میں روپیہ لگا رکھا ہے؛ مثلاً اگر تم کسی غیر منظّم ملک میں تیل کے مالک ہو تو تیل نکالنے کے اخراجات کے دو حصے ہوں گے: اوّل فنی یعنی تیل نکالنے کے سیدھے سادے مصارف، دوم سیاسی یا فوجی۔ یعنی باشندگانِ ملک کو قابو میں رکھنے کے اخراجات۔ تمہیں ان اخراجات کا صرف پہلا حصہ ہی برداشت کرنا ہوگا، اخراجات کا دوسرا حصہ جو ممکن ہے، بہت زیادہ ہو، ٹیکس ادا کرنے والوں پر پڑے گا جنہیں حبِ وطن کے پروپیگنڈے کے زور سے یہ بوجھ اُٹھانے پر آمادہ کیا جائے گا۔ اس طریقے سے حبِ وطن اور مالیات میں ایک نہایت نامناسب رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک مزید حقیقت ہے جس کو نوجوانوں سے نہایت احتیاط کے ساتھ چھپایا جاتا ہے۔

حبِ وطن کا جذبہ اپنی تمام جنگجویانہ شکلوں میں روپے پیسے کے ساتھ نہایت گہرے روابط

© rasailojaraid.com

رکھتا ہے۔حکومت کی مسلح افواج اہلِ ملک کو دولت مند بنانے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں یا کی جاسکتی ہیں۔اس چیز کی تکمیل کچھ تو خراج اور تاوان کی وصولی سے کی جاتی ہے، کچھ ان قرضوں کی ادائیگی پر اِصرار کرنے سے جو ردّ کیے جاسکتے تھے، کچھ اجناسِ خام پر قبضہ کرنے سے اور کچھ جبری تجارتی معاہدوں سے۔ اگر اس تمام طریق کار کو جذبۂ قومیت کے نظر فریب حسن نے چھپا نہ دیا ہوتا تو تمام معقول انسانوں پر اس کی بے ہودگی اور بُرائی واضح ہوجاتی۔

اگر آپ چاہیں تو تعلیم آسانی سے لوگوں میں انسانی نسل کے استحکام اور بین الاقوامی تعاون کا احساس پیدا کرسکتی ہے۔ایک ہی نسل کے اندر اندر اس تیز وتند جذبۂ قومیت کی آگ کو بجھایا جاسکتا ہے جس سے دنیا تکلیف میں مبتلا ہے، ایک ہی نسل کے اندر اندر اس جذبے کی دیواروں کو جو ہمیں روز بروز مفلس بنا رہی ہیں، پست کیا جاسکتا ہے۔جنگی تیاریاں جن سے ہم اپنے آپ کو موت کے خطرے میں مبتلا کررہے ہیں، ختم کی جاسکتی ہیں اور وہ خبثِ باطن جس سے ہم خود اپنی ناک آپ کاٹ رہے ہیں، جذباتِ خیر سگالی میں بدل سکتا ہے۔ جذبۂ قومیت جو اس وقت ہر طرف چھایا ہوا ہے، زیادہ تر سکولوں کی پیداوار ہے اور اگر اس کو ختم کرنا ہے تو ہمیں تعلیم میں نئی روح پھونکنا ہوگی۔

یہ معاملہ بھی تخفیفِ اسلحہ کی طرح بین الاقوامی سمجھوتے سے طے کرنا پڑے گا۔مجلس اقوام کو اگر کبھی چیرہ دست اقوام کے اعمال کی لیپ پوت سے فراغت مل گئی تو شاید وہ جلد یا بدیر معاملے کی اہمیت سے آگاہ ہوجائے۔ممکن ہے حکومتیں تاریخ کی ایک سی تعلیم پر راضی ہوجائیں، ممکن ہے اگلی جنگ عظیم کے ہلاکت سے بچے کھچے لوگ، بشرطیکہ کوئی زندہ بچ سکا، جمع ہوکر فیصلہ کریں کہ متعدد قومی جھنڈوں کی جگہ بین الاقوامی جھنڈے کو دے دی جائے، لیکن بلا شبہ یہ باتیں شیخ چلّی کے خواب ہیں۔

یہ اُستادوں کی فطرت ہے کہ جو کچھ وہ جانتے ہیں، وہی سکھاتے ہیں، خواہ یہ علم کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔فرض کیجیے کہ تاریخ کے انگریز اُستادوں کو ایک ایسے بین الاقوامی معاہدے کا خطرہ درپیش ہے جس کے ماتحت عالمی تاریخ کا پڑھانا ضروری ہوگا۔ ایسی حالت میں اُنہیں سن ہجری اور فتح قسطنطنیہ کی تاریخ بھی معلوم کرنی ہوگی۔ اسی طرح چنگیز خاں اور آئیوان مہیب

© rasailojaraid.com

(Terrible Ivan the) کے حالات جاننا پڑیں گے اور یہ بھی کہ جہازرانوں کا قطب نما چین سے نکل کر عرب ملاحوں کے پاس کیوں کر پہنچا اور یہ کہ سب سے پہلے یونانیوں نے مہاتما بُدھ کے مجسّمے بنائے۔ جب ان کے اوقات سے ایسے تقاضے کیے جائیں گے تو ان کی برہمی کی کوئی حد نہیں رہے گی اور وہ ایک ایسی نئی حکومت کے لیے جدوجہد شروع کردیں گے جو مجلس اقوام کے اَحکام کی خلاف ورزی کا حلف اُٹھالے۔

ہمارے عہد میں تمام مغربی دنیا کا سارا عملی زور سرمایہ دارانہ مہموں پر صرف ہو رہا ہے اور مجموعی طور پر یہ ایسی طاقت ہے جو تباہی کی طرف لے جارہی ہے۔ انسانوں کی وہ جماعتیں جو اچھے کام کرسکتی ہیں، مثلاً سکولوں کے اساتذہ ان کی ایک معتدبہ تعداد حالتِ موجودہ پر قانع ہے۔ اگر سماج میں کوئی اصلاح کی جائے گی تو اس سے ان کے اسباق میں بھی تبدیلی لازمی ہوجائے گی، اس لیے جہاں تک ممکن ہو، وہ اس سے بچنا ضروری سمجھیں گے۔ جس کوشش سے وہ بچنا چاہتے ہیں، اس کی حیثیت صرف عقلی نہیں بلکہ جذباتی بھی ہے۔ جانے پہچانے جذبات آسانی سے پیدا ہوجاتے ہیں اور ایک جانے پہچانے موقع پر (مثلاً قومی ترانے کے گائے جانے کے وقت) اپنے آپ کو نئے قسم کے جذبات پیدا کرنے کا ڈھب سکھانا مشکل ہے۔ اس طور پر ہماری موجودہ دنیا جہاں نیک آدمی کاہل ہیں اور صرف بُرے لوگ سرگرمِ عمل، بدقسمتی کے عالم میں چکر کھاتی ہوئی تباہی کی طرف جارہی ہے۔ بعض اوقات لوگ تباہی کے غار کو دیکھ لیتے ہیں، لیکن غیر حقیقی جذبات کا نشہ جلد ان کی آنکھوں کو بند کردیتا ہے۔ جو لوگ نشے کی حالت میں نہیں ہیں، ان کے لیے خطرہ بالکل واضح ہے۔ جذبۂ قومیت ہی وہ بڑی طاقت ہے جو ہماری تہذیب کو تباہی کی طرف دھکیل رہی ہے۔

نوٹ: انگلستان کے سرکاری سکولوں میں جذبۂ قومیت کا اندازہ مس بیرل ایلوارڈ (Miss Beryl Aylward) کی مثال سے لگایا جاسکتا ہے جسے کوونٹری (Coventry) کے سکول سے اس لیے موقوف کردیا گیا کہ اس نے امپائر ڈے کے موقع پر قومی جھنڈے کو سلامی دینے سے انکار کردیا تھا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ چونکہ وہ کوئیکر جماعت سے ہے، اس لیے وہ خود اپنے ملک کی قصیدہ خوانی کو بین الاقوامی جذبۂ خیر سگالی کا ممد نہیں خیال کرتی؛ لہٰذا ظاہر ہے کہ کوئی باضمیر کوئیکر یا صلح کل انسانی انگلستان کے کسی سرکاری سکول میں اُستاد کی اسامی پر نہیں رہ سکتا۔